ڈاکٹر محمد عباس

لیکچرر، شعبہ اردو،اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

اردو خاکہ نگاری میں تکنیک کے تجربات

Dr. Muhammad Abbas

Lecturer Department of urdu, Islamia College University, Pashawar

Experiments of Techniques in Urdu Sketch Description

The modern genre of Urdu Literature "Khaka Nigari" has passed through many stages of development. On the one hand, this genre has captivated the writers' heart and has got matchless fame, on the other many new experiments have been introduced into it. Every writer has developed it into his own techniques. Due to which, this genre has expanded in its technical aspects. This expansion may be taken into a positive sense and may be considered as new experimentation in this field. In this article, these experiments have brought under discussion.

انسان ہمیشہ سے انسان کا موضوع رہا ہے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی تمام ادبی اصناف کا کردار انسان ہی ہے۔ساری کہانیاں اور واقعات اسی ''مرکزی کردار'' کے اِرد گرد گھومتے ہیں۔جس طرح ابتدا میں انسان کے پاس وقت کی فراوانی نے اسے داستان تک محدود رکھا لیکن بعد میں وقت کی کمی نے اسے داستان سے ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر افسانہ اور افسانچہ تک کے سفر کا احساس دلایا۔ اسی طرح موجودہ مشینی دور کی مصروفیات نے انسان کی فراغت وفرصت کے لمحات کو انتہائی مختصر کر کے رکھ دیا ہے۔طویل سوانح عمریوں، آپ بیتیوں اور خودنوشت سوانح کی جگہ اب خاکہ نگاری لے رہی ہے۔علاوہ ازیں دوسروں کے بارے میں اور خاص طور پر مشاہیر کے بارے میں جاننا اور ان کے خلوت وجلوت سے آگاہی حاصل کرنا ہر ایک کا شوق ہونے کے باوجود ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔اور پھر وہ ہستیاں جو ماضی کا حصہ بن گئیں ان سے ملاقات کی حسرت اور انہیں چلتی پھرتی صورت میں دیکھ لینے کی تمنا تو ہمیشہ ہی دل میں ایک تشنہ آرزو کی صورت پلتی رہی۔خاکہ نگار اس صنف کے ذریعے ہمیں وقت کی قید سے آزاد کر کے نہ صرف ان شخصیات سے ہماری ملاقات کراتا ہے بلکہ ہمارے درمیان حائل اجنبیت کی خلیج کو بھی بڑے مختصر وقت اور تحریر میں پاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک جامع اور عمدہ خاکہ پڑھ لینے کے بعد موضوع شخصیت سے ملاقات اور بے تکلفی کا احساس تادیر قاری کو تروتازہ رکھتا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ کہ لوگ ادیبوں سے نہیں انسانوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ورنہ ادیبوں سے تو محفلوں میں اور کتابوں میں

ملاقات ہوتی رہتی ہے، بنے سنورے پُرتکلف انداز میں، جی حضوری کے روّیے میں۔ اصل چہرہ ان مواقع پر تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وقتی طور پر ہم سب اداکار ہیں اور تھوڑی بہت اداکاری تھوڑی دیر کے لیے کر ہی لیتے ہیں۔ قیمتی لباس اور جُبّہ ودستار میں لپٹے لپٹائے لوگ تو سب دیکھتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں خاکہ نگار تو اس شخصیت سے ملاتا ہے جو سب سے چھپ چھپا کے، تصنع اور بناوٹ کے پردوں کے اندر کہیں دُبکی چھپی بیٹھی ہوتی ہے۔

> جہاں تک اردو خاکہ نگاری کا تعلق ہے تو اس کے متعلق بھی ہر لکھاری نے اپنی سوچ اور دانست کے مطابق بہتر سے بہتر رائے دے کر اس کی حدود متعین کیں۔ ظاہر ہے ان کی اس مخلصانہ کوشش کو قدر ہی کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی کی اس سلسلے میں کی ہوئی ''تعریف'' نہ صرف جامع اور قابل تقلید ہے بلکہ اس کی روشنی میں خاکہ نگاری کی سرحدیں بھی دوسری ملتی جلتی اصناف اور تحریرات سے بڑی آسانی سے الگ کی جاسکتی ہیں۔
>
> **ان کے مطابق**
>
> **''خاکہ ایک ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔''** [1]

اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اگرچہ ''آبِ حیات'' (۱۸۸۰ء) یا بعض تذکروں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن اسے باقاعدہ خاکہ نگاری کی بجائے ایک لاشعوری اُمنگ یا ترنگ کہا جاسکتا ہے جس کی تخلیق کے وقت ان کے سامنے خاکے کی کوئی ''تعریف'' یا کوئی ''مثال'' موجود نہ تھی بلکہ یہ ان کی اپنی کوشش تھی کہ اس انداز سے لفظوں کی صورت میں بعض شخصیات کی چلتی پھرتی تصویریں اور زندگی کے بعض گوشے محفوظ کیے جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ''آبِ حیات'' ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے باقاعدہ خاکہ نگاری کا شعور دلایا اور اس صنف کے لیے مستقبل کا رستہ ہموار کیا۔ جس پر آگے چل کر فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر اسے اس مقام تک پہنچا دیا کہ جس پر اُردو ادب بلاشبہ فخر کا حق رکھتا ہے۔

فرحت نے اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں اپنے استاد کی شخصیت کے ظاہر و باطن اور خلوت وجلوت کے وہ روپ پیش کیے جو آنے والے خاکہ نگاروں کے لیے قابلِ تقلید بن گئے۔ ان کے بعد ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اس صنف کی آبیاری کے لیے فن کی اس دودھاری تلوار پر چل کر کافی حد تک اس کا حق ادا کیا۔ اس کوشش میں کسی نے اپنی ساری زندگی اس صنف کے نام کی تو کسی نے محض ''کٹا کے انگلی شہیدوں میں نام کرتے ہیں'' کے مصداق اپنا حصہ ڈالا۔

شخصیت کے اصل چہروں کی تلاش میں جنم لینے والی یہ صنف کم عمری کے باوجود آج اردو ادب کی ایک توانا صنف بن چکی ہے۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک اردو خاکہ آہستہ آہستہ کئی منزلیں طے کر گیا لیکن اچانک ۱۹۹۰ء کے بعد اس صنف میں وہ تیزی اور تجربے دکھائی دیئے کہ جو کسی بھی معتبر اور زرخیز صنف کے لیے جزو لاینفک کا درجہ رکھتے ہیں۔ خاکے لکھنے والوں میں جہاں کہنہ مشق ادیب اور قلمکار مرد و زن

شامل ہیں، وہاں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق لکھاریوں نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا جن میں فوج، افسر شاہی، درس و تدریس، طب، صحافت اور مختلف شعبوں کے افراد شامل ہے۔ بعض خاکہ نگاروں کی پہلی ہی کوشش اتنی توانا اور بھرپور رہی کہ انہیں اس میدان میں امر کر گئی جبکہ بعض کے ہاں گنتی کے چند خاکے ہی مل سکے، لیکن ان کی اس کاوش نے بھی انہیں اس کارواں کے سفر میں شمولیت کا اعزاز بخشا۔

اس سفر میں جہاں اردو خاکہ نگاری کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا رہا وہاں اس میں بعض نت نئے تجربات بھی ہوتے رہے۔ جن کی باقاعدہ تقلید تو بعد کے خاکہ نگاروں سے نہ ہو سکی لیکن ان تجربات نے کم از کم اس صنف کی وسعت اور ہمہ گیری کا پتا ضرور دیا۔

فنی لحاظ سے دیکھ لیا جائے تو اردو ادب میں خالص خاکوں کی تعداد کی کمی کی ایک بنیادی وجہ خود ادیب کی اپنی شخصیت کا عدم توازن ہے کہ وہ کسی دوسری شخصیت کے بارے میں لکھتے وقت خود کو کسی ضابطے یا قانون کا پابند نہیں سمجھتا۔ بلکہ جو جس طرح کی بھی معلومات و واقعات جمع ہو گئیں ان کو شخصیت کے اردگرد بے ترتیبی سے لپیٹ کر پیش کر دیا۔ اور خاکہ بن گیا۔ اس سے بڑھ کر ایک اور خرابی جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہے وہ بدقسمتی سے اس روایت کا جنم لینا ہے کہ جس کتاب کا بھی مقدمہ یا دیباچہ وغیرہ لکھنے کا کسی کو موقع ملا، اس نے خاکہ نگاری کے فن اور اُصولوں کو خاطر میں لائے بغیر ہی اس کتاب کی نہ صرف تعریف کی بلکہ اسے اردو خاکہ نگاری کے عمدہ مجموعوں میں سے بھی گردانا۔ اس محض گن گانے کے انداز نے ادب اور ادیب دونوں کو نقصان پہنچایا کہ دونوں ہی خالص خاکہ نگاری کے حوالے سے غلط فہمی کے شکار رہے۔

اسی طرح بعض خاکہ نگار اپنی ذات کی جگہ جگہ نمائش سے بھی دامن نہ بچا سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ خاکہ نگار خود جن واقعات کا چشم دید گواہ ہوتا ہے انہیں اپنے تذکرے کے بغیر پیش نہیں کر سکتا لیکن میرے نزدیک اس لمحے خاکہ نگار کی مثال ایک کیمرہ مین کی سی ہونی چاہیئے کہ جو ہر منظر میں موجود ہوتے ہوئے بھی اصل منظر سے کنارہ کش رہتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اصل مرکزِ نگاہ موضوع شخصیت ہونی چاہیے نہ کہ خاکہ نگار کی بے احتیاطی سے تحریر خود خاکہ نگار کے کارناموں کا پلندہ بن جائے۔

اکثر اوقات ایک دو رسمی ملاقاتوں کے بعد یا تھوڑی دیر کسی کی گفتگو سن لینے کے بعد ذاتی نقطۂ نظر سے بھی خاکہ لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں خاکہ تاثراتی اور تعارفی مضمون بن جاتا ہے۔ بلکہ بعض تحریروں میں تو تاثراتی، تعارفی، تنقیدی اور سوانحی مواد کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا ہے کہ اسے کس صنف میں رکھا جائے۔

ایک اور چیز جس نے خاکہ نگاری کی اصل روح کو نقصان پہنچایا وہ اس صنف کے بارے میں لکھنے والوں کا غیر سنجیدہ روّیہ ہے کہ شخصیت کو پکڑ کر اس کی بدحواسیوں اور کمزوریوں کا انتہائی مضحکہ خیز اور مبالغہ آمیز انداز میں جائزہ شاید خاکہ نگاری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غم انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اور اس کی شدت کو کم کرنے کی غرض سے وہ ہنسی اور قہقہوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ موجودہ دور کی معاشرتی اور معاشی پریشانیوں اور ناہمواریوں نے شاید خاکہ نگاری میں بھی مزاح کے اس انداز کو رواج دیا۔ بہرحال اس کا زیادہ تر انحصار خاکہ نگار یا موضوع شخصیت کے مزاح کی طرف فطری میلان پر ہے۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں شگفتہ مزاج ہیں تو پھر بلاشبہ مزاح کی موجودگی خاکے کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ ورنہ مزاح اور لطائف کی بے جا اور بے محل شمولیت شخصیت اور خاکہ نگار دونوں کو اعتبار کے درجے سے گرا دیتی ہے۔

بعض خاکہ نگاروں نے سوانحی مضمون کی طرح محض واقعات اور اَتا پتا جمع کر کے ان سے خاکہ تیار کرنے کی کوشش کی لیکن ایسی کوشش میں وہ تحریریں خاکہ بننے کی بجائے خاکے سے مزید دور ہو گئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شخصیت کو ماحول سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر انسان

انسانوں کے درمیان ہی رہتا ہے جہاں روز نت نئے واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ہر واقعے کے ساتھ انسان کی شخصیت کا بھی تعلق جوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن خاکہ نگار کا کام تاریخ مرتب کرنا نہیں بلکہ اس کی مرکز نگاہ شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تاریخ اور واقعات اہمیت تو رکھتے ہیں لیکن صرف اس قدر کہ اس سے شخصیت کا کوئی پہلو سامنے آ سکے ورنہ صرف ناظر کی حیثیت سے موضوع شخصیت کا کسی منظر کا نظارہ کر لینا اور پھر آگے بڑھ کر کسی اور سے سرا ہے واسطہ پڑنا وغیرہ وہ واقعات نہیں ہیں کہ جنہیں خاکہ نگاری میں جگہ یا بنیادی اہمیت دی جائے۔ خاکہ نگار کے لیے وہی واقعات اہم ہوتے ہیں جو شخصیت سے وابستہ ہوتے ہیں نہ کہ شخصیت جن سے وابستہ ہو۔ کیونکہ پہلی صورت میں اہمیت شخصیت کی ہوگی جبکہ دوسری صورت میں اہمیت واقعات کو حاصل ہوگی۔

خاکے عام شخصیات کے علاوہ فرضی کرداروں کے بھی لکھے گئے جو فن کے لحاظ سے دلآویز اور دلچسپ تو ضرور ہیں لیکن فرضی ہونے کی بنا پر ان میں کسی شخصیت سے ملاقات کا وہ احساس نہیں ملتا جو معاشرے کے کسی عام یا خاص کردار سے متعلق خاکے کا وصفِ خاص ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے کردار لالہ جی، مسٹر اُلّو اور حکیم جی جبکہ ڈاکٹر یونس بٹ کا کردار مسٹر ''ف'' اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حکیم جی کے بارے میں لکھتے ہیں،

> ''انسانیت سے زیادہ نسائیت کے قائل ہیں۔ لوگوں کی بیوی کے لیے 'جیتی رہو' اور اپنی کے لیے 'جوتی رہو' کے مقولے پر عرصے سے کاربند ہیں'' ۲
>
> ''نظر ایسی کہ اب کسی مقدمے میں چشم دید گواہ کی بجائے چشمہ دید گواہ بنتے ہیں'' ۳

کسی شخصیت کے خطوط، شاعری یا تحریروں کے مطالعے کے بعد اس سے نتیجہ اخذ کر کے بھی خاکے لکھنے کی کوشش کی گئی جن میں ماضی اور حال دونوں کی شخصیات کے خاکے موجود ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے غالب سے متعلق دو خاکے ''غالب شریر خامہ'' (ذاتیات) اور ''آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے'' (خودستائیاں) جبکہ مشتاق احمد یوسفی سے متعلق خاکہ ''سوانحِ نوعمری'' (خودستائیاں) اس کا ثبوت ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کے ہاں ''پشوری امریکن'' (حسابِ دوستاں) کے عنوان سے ڈاکٹر امجد حسین کے بارے میں تحریر بھی ایک نئے انداز کا پتا دیتی ہے جس میں ابتدائی تعارفی حصے کے بعد ٹیلی فونک گفتگو اور خطوط کے طویل تذکروں سے موضوع خاکہ کی شخصیت کے حوالے سے بعض باتوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور انوکھا تجربہ لطیف الزماں خاں کے ہاں ''ان سے ملیے'' میں بھی دکھائی دیتا ہے جس میں انہوں نے شخصیت کو اس کی عادات واطوار کی بجائے باقاعدہ اس کی ادبی پسند و ناپسند اور ذوق کے معیار سے پرکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ان ادبا و شعرا کے حوالے سے بھی پہچانا جا سکتا ہے جن کی تحریریں وہ شوق سے پڑھتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ شخصیت کو اس کے ذوقِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تجزیے کی کسوٹی پر کھتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بارے میں آپ کا مضمون ''دوسری کرن'' اور شید احسن زیدی سے متعلق تحریر ''سخن طراز'' (ان سے ملیئے) قابل ذکر ہیں۔

اسی قسم کا ایک تجربہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے ہاں ''گلدستۂ احباب'' میں بھی ملتا ہے جس میں انہوں نے ایک گہرے دوست

ضمیرالدین احمد کی وفات کے بعد اُن کے نام ایک طویل خط لکھ کر اسے خاکہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خط اگر چہ اسلم فرّخی اور موضوع شخصیت دونوں کا مشترکہ سوانحی مضمون بن گیا ہے لیکن تکنیک کے لحاظ سے یہ ایک نیا انداز اور تجربہ ضرور ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس خط کے آخری جملے ملاحظہ ہوں'

''تم سدا کے جلد باز تھے۔ اپنی نانی کے بقول 'بے چین بوٹی'
آخر آخر میں بھی تم نے وہی بے چینی دکھائی۔ گھبرا کر چل دیے،
زنجیریں تُڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے، کیا انسان تھے، جلد باز، اکڑ
باز نخرے باز، مگر تمھارے ہر روپ میں موہنی تھی کیسے من موہن تھے۔
تمھارے اور ہمارے مشترک دوست ہوش فرخ آبادی کا ایک شعر یاد
آرہا ہے۔

روداد زندگی ہی خود جان زندگی ہے
بڑھتا گیا فسانہ کہتے گئے جہاں تک

۲۳ مارچ ۱۹۹۱ء ہمیشہ کی طرح تمھارا
(اسلم)'' [۴]

اختر حامد خاں کی ''نئے خاکے'' اگر چہ خاکہ نگاری کے لحاظ سے قابلِ اعتنا نہیں ہے لیکن آپ کا مخصوص انداز ایک نئی صورت ضرور لیے ہوئے ہے جس میں ان کی نظر شخصیت کی بھرپور پیشکش کی بجائے جلد سے جلد مضمون سمیٹنے پر مرکوز رہی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شخصیت کے محاسن ومعائب کی بجائے کسی مشین کے ایک ایک پرزے کے بارے میں آگاہ کیا جارہا ہو۔

ممتاز مفتی کے ہاں بھی نفسیاتی اور فلسفیانہ انداز میں شخصیت کو سامنے لانے کا رجحان ایک نیا تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ جس میں ان کی نظر شخصیت کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے باطن اور باطنی ہنگاموں پر بھی ہوتی ہے۔ بلکہ نفسیات کا یہ پہلوان کی تحریروں میں اس قدر حاوی نظر آتا ہے کہ وہ موضوع شخصیت کے علاوہ اپنے قاری کی نفسیات کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ دوسروں کی نفسیات کے کھوج میں اپنی باطنی دنیا کے دَر بھی وا کر دیتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ کب اور کس طرح کون سی بات کہاں کہنی ہے اور اسی انداز سے وہ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ ویسے تو یہ انداز آپ کے خاکوں کے تمام مجموعوں میں پایا جاتا ہے لیکن ''اوکھے اولڑے'' میں ایک نیا تجربہ اور بھی کیا گیا ہے۔ اپنے بیٹے عکسی مفتی کے بارے میں تحریر ''لوک ورثہ'' میں نفسیات اور فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ ساتھ باپ نے بیٹے کی عادات واطوار کے ساتھ اپنی عادات واطوار کا موازنہ کر کے ایک نئی اور دلچسپ صورت پیدا کی ہے کہ ایک شخصیت کے زیرِ سایہ پلنے والی اولاد ہزار کوششوں اور تربیت کے باوجود کس طرح سے خُو خصلت میں والدین سے مختلف ہوتی ہے۔ تضاد کی اس صورت نے جہاں عکسی مفتی کا چہرہ بے نقاب کیا ہے وہاں ممتاز مفتی کی اپنی شخصیت بھی اس موازنے میں کافی حد تک سامنے آگئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو،

''میں مافوق الفطرت کو مانتا ہوں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر مافوق
الفطرت حقیقت بھی ہو پھر بھی ہمیں اس پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔

میں روح کو مانتا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے کہ روح بھی مادے کی ایک
لطیف شکل ہے۔ مجھے ادب سے دلچسپی ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ
ہمارا ادب حقائق سے گریز سکھاتا ہے۔۔۔۔۔ میں پیر پرست ہوں
وہ خدا پرست ہے'' ۵

علی معین کے ہاں ''بھگوا بھیس'' میں بھی نفسیاتی داؤد پیچ کا یہ انداز زیادہ واضح ہے۔ احمد بشیر کی ''جو ملے تھے راستے میں'' بھی اس لحاظ سے ایک تجربے کی خصوصیات رکھتی ہے کہ ممتاز مفتی سے متعلق خاکے ''سورما'' میں انہوں نے ممتاز مفتی کی ڈائری کا ایک ورق لے کر شامل کیا ہے جو باقاعدہ ایک اقبالی بیان کی صورت میں ان کی شخصیت کے کئی گوشوں کو بہ تصریح پیش کر رہا ہے۔ خطوط اور نثر پارے تو پہلے بھی خاکوں میں شامل کیے جاتے رہے ہیں لیکن ڈائری کا ورق اس خوبصورتی سے شامل کرنا کہ شخصیت کے چھپے گوشوں کو بھی طشت از بام کر دے شاید پہلا کامیاب تجربہ ہے۔ اگست ۱۹۳۵ء کی ڈائری کے اس ورق کی ایک مثال ملاحظہ ہو،

''ملتان: اگست ۱۹۳۵ء

میری طبیعت بے ہنگم، بے لگام، اور بے صبر ہے۔ اس میں روانی
نہیں، نظم نہیں، ضبط نہیں۔ میری طبیعت میں بنیادی طور پر جو جذبہ
کارفرما ہے جھجک اور کمتری ہے۔ مجھ میں باقاعدہ چلنے کی اہلیت
نہیں۔ ہاں کبھی کبھی بدک کر بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں'' ۶

تجربات کے سلسلے میں ڈاکٹر امجد حسین کی سوانح ''دَر مکتب'' کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس میں خاکے کی بنیادی ساخت اور تکنیک میں کوئی تجربہ تو نظر نہیں آتا لیکن یہ کتاب اس لحاظ سے دلچسپ اور اچھوتی ضرور ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے الگ سے خاکوں کا مجموعہ مرتب کرنے کی بجائے اپنی سوانح عمری ہی میں جگہ جگہ بڑی خوبصورت ترتیب سے اپنے سکول، کالج اور یونیورسٹی کے زمانے کے اساتذہ کے خاکوں کو کھپانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خاکے جہاں ان کے اساتذہ کی شخصیت کو اُجاگر کرتے ہیں وہاں آپ کی سوانح عمری کی بُنت اور ترتیب میں بھی ان کا اہم حصہ ہے۔

پروفیسر خاطر غزنوی کی کتاب ''ایک کمرہ'' کو بھی ایک تجربہ ہی کہا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے کسی ایک شخصیت کی پیشکش پر اکتفا کرنے کی بجائے اس دَور کی بے شمار ادبی شخصیات، روایات، تاریخ، تہذیب، ادبی چپقلشوں اور تحاریک تک کو جمع کر کے ایک ہی خاکہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شخصیات کی بہتات کی وجہ سے اگرچہ نظر کسی ایک شخصیت پر ٹکتی ہی نہیں لیکن خود ہی اسے ''خاکوں بھرا خاکہ'' قرار دے کر ایک نیا تجربہ ضرور کیا ہے۔

بعض خاکہ نگاروں کے ہاں ایک انداز یہ بھی ملتا ہے کہ اپنے خود ساختہ معیاروں پر شخصیت کو پرکھ کر فیصلے صادر کرتے ہیں۔ اس کی واضح صورت رحیم گل کے ہاں نظر آتی ہے۔ خاص طور پر ان کے دوسرے مجموعے ''خدوخال'' میں یہ صورت زیادہ نمایاں ہے۔

بعض خاکہ نگاروں کے ہاں اس سے ملتی جلتی ایک اور صورت بھی ملتی ہے۔ جس کی رُو سے وہ چند خصوصیات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر وہ خصوصیات انہیں کسی شخصیت کے ہاں نظر آئیں تو اس کو دل میں اتار کر اور سر آنکھوں پر بٹھا کر اس پر قلم اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اکثر ایسی تحریروں پر ایک ہی چہرہ سجا نظر آتا ہے۔ مسعود جاوید کی ''حدیثِ دلبراں'' قمر یورش کی ''یادوں کے اُجالے'' ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''شجر ہائے سایہ دار'' اور سید محمد ابوالخیر کشفی کی ''اُجلے لوگ'' وغیرہ اس حوالے سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

چہروں کی یکسانیت کا یہ انداز سنجیدہ تحریروں کے علاوہ مزاحیہ تحریروں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تمام ہی کردار بوکھلائے ہوئے، پراگندہ اور اُوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انور جمال کی ''پراگندہ طبع لوگ'' اقرار حسین شیخ کی ''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور یونس بٹ کے تمام مجموعے اس کی مثال ہیں۔

اکثر خاکہ نگاروں نے خاکہ لکھتے وقت خاکے سے بڑھ کر اس کے عنوان کا بھی خیال رکھا ہے کہ اس سے قاری اور موضوع شخصیت دونوں کو آسانی سے گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ اکثر خاکہ نگاروں کے ہاں یہ کوشش بڑی کامیاب اور مؤثر بھی ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خاکے اپنے ناموں کے حوالے سے بھی موضوع شخصیت کی کافی حد تک وضاحت کرتے ہیں۔

ان تجربات کے علاوہ ایک خامی بھی بعض خاکہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ جس کی بنیادی وجہ اس صنف کی مقبولیت، مارکیٹ میں کتاب کی مانگ یا خالص خاکوں کی تخلیق کی دشواری دکھائی دیتی ہے۔ بنابریں کئی خاکہ نگاروں کے ہاں ہر نئی کتاب میں پچھلی کتاب کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور شامل رہا۔ اس سلسلے میں ممتاز مفتی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، اکبر حمیدی اور یونس بٹ کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ممتاز مفتی کے ہاں ان کی پہلی کتاب ''پیاز کے چھلکے'' (۱۹۶۸ء) کے تقریباً نصف خاکے ان کے دوسرے مجموعے ''اوکھے لوگ'' (۱۹۸۶ء) میں بھی تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ شامل کیے گئے۔ یہی حال ان کے تیسرے مجموعے ''اور اوکھے لوگ'' (۱۹۹۰ء) کا ہے جس میں بارہ پرانی اور بارہ نئی شخصیات شامل ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر نصف کتاب ''اوکھے لوگ'' جبکہ نصف ''اور اوکھے لوگ'' پر مشتمل ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے چوبیس خاکوں پر مشتمل مجموعے ''خاکہ نگری'' (۲۰۰۲ء) میں بھی ان کے پہلے مجموعے ''قلمی دشمنی'' (۱۹۹۲ء) سے دس خاکے اور دوسرے مجموعے ''ذاتیات'' (۱۹۹۷ء) سے گیارہ خاکے لے کر شامل کیے گئے ہیں۔

''اکبر حمیدی کے پہلے مجموعے ''قدِ آدم'' (۱۹۹۳ء) کے اکیّس خاکوں میں سے آٹھ خاکے لے کر انہیں تین نئے خاکوں کے ساتھ ملا کر ''چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' (۱۹۹۹ء) کے نام سے شائع کیا گیا۔

ڈاکٹر یونس بٹ کے ہاں اگرچہ خالص خاکوں کی بجائے محض مزاح کی تخلیق کا رجحان نظر آتا ہے لیکن پرانی تحریروں پر نئے لیبل لگا کر چھاپنے کی خامی ان کے ہاں سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں ہر نئی کتاب پچھلی کتب کی کئی تحریروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن ایک جگہ تو انہوں نے کمال ہی کر دیا کہ ''غل دستہ'' (۱۹۹۴ء) اور ''شناخت پریڈ'' (۱۹۹۰ء) کو مکمل طور پر یکجا کر کے ''بٹ صورتیاں'' (۱۹۹۹ء) کے نام سے شائع کر دیا۔

اس قسم کی خامیوں کو ہم جو بھی نام دیں بہر حال یہ قارئین کے ساتھ ناانصافی ضرور ہے۔ مختصر طور پر اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ:

☆ جس نے لوگوں کی عبرت اور سبق حاصل کرنے کی غرض سے یا اپنے ہم خیال ہونے کی وجہ سے شخصیات پر لکھا تو انتخابِ شخصیات میں بھی اکثر مشاہیر ہی کو لیا اور پھر صرف ان کے محاسن ہی سامنے رکھے۔ جس سے مطلوبہ مقاصد تو حاصل ہو گئے لیکن تحریریں خالص خاکوں کی بجائے تاثراتی بن گئیں۔ سید محمد ابوالخیر کشفی، مولوی عبدالحق وغیرہ کے ہاں یہ انداز نظر آتا ہے۔

☆ جس نے محض مزاح کی تخلیق کی خاطر لکھا، اس نے شخصیت کو مسخرہ بنا دیا۔ بلکہ باقاعدہ لطائف گھڑ گھڑ کر یا پرانے لطائف شخصیات سے وابستہ کر کے انہیں پیش کر دیا۔ جس سے شخصیات کے چہرے اس قدر مسخ ہو گئے کہ سب پر سٹیج اور میلوں ٹھیلوں کے جوکرز کا گمان گزرتا ہے۔

اقرار حسین شیخ، ڈاکٹر یونس بٹ، انور جمال اور کسی حد تک عطاء الحق قاسمی کی تحریریں بھی اس نوعیت کی ہیں۔

☆ جس نے ماضی اور دوستوں کے بچھڑنے کا غم دل سے لگا کر قلم اُٹھایا اس کے ہاں یادنگاری اور کسی حد تک ''میں'' کا عنصر بھی در آیا۔ سحاب قزلباش، ڈاکٹر اسلم فرخی، عاشق حسین بٹالوی، حمیدہ اختر حسین رائے پوری، محترمہ اختر جمال اور حیدر قریشی کی مثالیں اس حوالے سے دی جا سکتی ہیں۔

☆ جو خاکے تقریباتی ضرورت کے تحت لکھے گئے ان میں اکثر بناوٹ اور تصنع کا رنگ پیدا ہو گیا۔ جبکہ اکثر اوقات شخصیت کی کمی تنقید اور ادبی مقام کے تذکرے سے پوری کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی تحریریں اس ہمدردانہ انداز اور بے ساختگی سے اکثر محروم رہیں جو موضوع شخصیت کے معائب کو بھی قابل برداشت اور قابلِ محبت بناتی ہے۔ ایسی مثالیں تقریباً ہر خاکہ نگار کے ہاں ملتی ہیں۔

☆ بعض تحریریں خاکہ نگاری کے اصولوں سے ناواقفیت اور محض شوقِ تحریر کو پورا کرنے کی غرض سے سامنے آئیں جن میں جزوی طور پر تو خاکے کے بعض عناصر شامل ہو گئے لیکن مکمل خاکے نہ بن سکے۔ ایسی تحریریں اس مقالے میں عموماً قلم انداز ہی کی گئیں لیکن صرف نام وغیرہ کی حد تک ان کا تذکرہ مقالے میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔

☆ جس نے خالص شخصیت کو پیش کرنے کی غرض سے لکھا تو وہاں نہ صرف توازن کی حالت رہی بلکہ وہ تحریریں یقیناً عمدہ خاکوں کا روپ بھی دھار گئیں۔ اس قسم کی دو چار تحریریں تو کئی خاکہ نگاروں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر یہ خوبی جن کے ہاں نظر آتی ہے ان میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، شاہد حنائی، لطیفا لزماں خاں، یونس جاوید، شفیع ہمدم، سلمان باسط، مشہود حسن رضوی، احمد بشیر، لُطف اللہ خاں، سید انیس شاہ جیلانی، احمد عقیل روبی اور ممتاز مفتی وغیرہ شامل ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱)	خاکہ نگاری، فن و تنقید	ڈاکٹر بشیر سیفی	ص ۱۷
۲)	ذاتیات	ڈاکٹر اشفاق ورک	ص ۱۳
۳)	ذاتیات	ڈاکٹر اشفاق ورک	ص ۱۴
۴)	گلدستۂ احباب	ڈاکٹر اسلم فرخی	ص ۲۴۷
۵)	اوکھے اولڑے	ممتاز مفتی	ص ۱۷۵
۶)	جو ملے تھے راستے میں	احمد بشیر	ص ۱۷۶

کتابیات

۱) اوکھے اولڑے، ممتاز مفتی۔ فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، راولپنڈی، کراچی اوّل ۱۹۹۵ء

۲) جو ملے تھے راستے میں، احمد بشیر۔ (تحقیق و ترتیب یونس جاوید) گورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۶ء

۳) خاکہ نگاری، فن و تنقید۔ ڈاکٹر بشیر سیفی۔ نذیر سنز پبلشرز اردو بازار لاہور بار دوم ۱۹۹۳ء

۴) ذاتیات، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک۔ الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، لاہور ۱۹۹۷ء

۵) گلدستۂ احباب، ڈاکٹر اسلم فرخی۔ حوری نورانی مکتبہ دانیال کراچی اول، اگست ۱۹۹۴ء